© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تعلیمی نفسیات میں یہ موضوع اکثر زیرِ بحث رہتا ہے کہ کیا الفاظ کے بطن سے تخیلات پیدا ہوتے ہیں یا خود خیالات و احساسات الفاظ کے رنگا رنگ پیکر تیار کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر بعض مفکرین کے مابین دلچسپ نوک جھونک بھی ہوئی ہے۔ ایک گروہ الفاظ کو تخیلات کا خالق سمجھتا ہے اور دوسرا الفاظ کے سانچوں کو خیال و احساس کی کرشمہ سازی تصور کرتا ہے۔

یہ بحث اگرچہ بڑی دلچسپ ہے مگر عملی نقطۂ نظر سے محض "تحصیل حاصل" ہے۔ دونوں گروہوں کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں اگرچہ دونوں کا اندازِ بیان مختلف ہے۔ الفاظ و معانی میں نہایت گہرا ربط ہے۔ اتنا گہرا کہ ایک کو دوسرے سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کے قالب خیال و احساس کی نشاندہی کرتے ہیں اور خیال و احساس کا وجود الفاظ کے ڈھانچے تیار کرتا ہے۔ یہ عمل بیک وقت انجام پاتا ہے اس لیے یہ کہنا ناممکن ہے کہ اوّلیت کا شرف کسے حاصل ہے۔

الفاظ و معانی کے درمیان جو گہری وابستگی موجود ہے اس سے کہیں زیادہ گہرا اور قریبی تعلق کسی قوم کے افکار و نظریات اور اس کی طرزِ معاشرت کے مابین پایا جاتا ہے جس طرح کسی قوم کے احساسات و معتقدات جب اجتماعی طور پر عمل کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں تو ان سے ایک خاص قسم کی تہذیب جنم لیتی ہے، اسی طرح ایک خاص قسم کی طرزِ معاشرت سے انسانوں کے اندر ایک خاص نوعیت کا ذہنی رجحان اور اندازِ فکر پرورش پاتا ہے۔ جب دنیا کی کوئی قوم اپنا نقطۂ نظر بدلتی ہے تو اس سے لازمی طور پر اس کے رہنے سہنے کے ڈھنگ اور طریقے بھی بدل جاتے ہیں اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برعکس جب کسی قوم کا اندازِ زیست تبدیل ہوتا ہے تو اس سے اُس کے فکر و نگاہ کے زاویے خود بخود متغیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

فکر و نظر اور طرزِ معاشرت کے مابین اس باہمی رابطہ کا بار بار ذکر سن کر کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم افکار و نظریات اور کسی ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کے درمیان کسی تعلق کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی باہمی قربت کا پورا پورا احساس ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کوئی نظریہ یا عقیدہ اپنی جڑیں معاشرت کے رگ و پے میں جتنی گہری پھیلاتا ہے کسی اور جگہ نہیں پھیلا سکتا۔ اسی طرح کسی قوم کی تہذیب جس خوبی کے ساتھ اُس کے افکار و نظریات کو نکھارتی ہے اور اس کی طرزِ معاشرت، جس عزم و استقلال کے ساتھ اُس کے احساسات اور معتقدات کی حفاظت اور پاسبانی کرتی ہے کوئی دوسرا شعبۂ حیات نہیں کر سکتا۔

سیاسی نظام ایک بارڈر لائن ہے جو ہمارے وجود کو دوسری اقوام سے ممیّز کرتی ہے۔ یہ وہ سرحد ہے جس کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ قوانین کی چوکیاں اور پہرے بٹھلائے جاتے ہیں تاکہ اس کے اندر پناہ لینے والے لوگ سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہمارے قومی بقا میں اس نظام کو اگرچہ بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر اس کا دائرۂ کار بہت محدود ہے۔ یہ زندگی کے ایک نہایت مختصر سے حصّے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا بیشتر کام قوم کے افراد کو داخلی اور خارجی ریشہ دوانیوں سے نجات دلانا ہے۔ یہ فرض بلاشبہ سب سے ضروری اور بنیادی ہے مگر اس کی نوعیت زیادہ تر سلبی ہے۔ یہ نظام قوم کے مختلف لوگوں کو ایک خاص طرزِ عمل کے لیے مواقع تو بہم پہنچاتا ہے مگر انہیں سرگرمِ عمل نہیں کرتا۔ قریب قریب یہی حال معاشی نظام کا بھی ہے۔ یہ بھی حیاتِ انسانی کے صرف چند گوشوں کو متاثر کرتا ہے مگر پوری زندگی پر حاوی نہیں ہوتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ نظام جو ہمارے گھروں میں گھس کر ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں ہم پر اثر انداز ہوتا ہے وہ معاشرتی نظام ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ اور ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جس پر اس نظام کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔ خلوت گاہوں میں ہم جس ضابطۂ حیات کے تحت زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ درحقیقت ہماری معاشرت اور ہماری بود و باش کے ڈھنگ ہیں۔ سیاسی قوانین کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے معاشرتی ضابطوں کی پُرامن دنیا کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ضابطے سارے کے سارے داخلی اور ایجابی ہیں۔ ہماری زندگی کے وہ گوشے جو فوج اور پولیس کی دسترس سے باہر ہیں وہ معاشرتی قوانین کی زد میں آتے ہیں۔ یہ ہم پر ٹھونسے نہیں جاتے بلکہ ایک خاص اندازِ فکر انہیں ہمارے اندر سے ابھارتا ہے اور ایک خاص اندازِ زیست انہیں پروان چڑھاتا ہے۔ ان کی کونپلیں ہمارے اپنے احساسات کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں اور پھر تناور درخت بن کر ہماری حیات کے سارے گوشوں کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ انہیں کوئی جبر پیدا نہیں کرتا بلکہ ہماری رضا اور خواہش تخلیق کرتی ہے۔ یہی وہ حصار ہیں جنہیں خود ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اور پھر ان کے اندر برضا و رغبت زندگی بسر کرتے ہیں۔ معاشرتی علوم کے ماہرین نے اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے تقریباً نوّے فیصد کاموں میں ہماری معاشرت کو براہِ راست دخل ہوتا ہے۔ اسی سے ہماری عادات کے سانچے بنتے ہیں اور ہماری رسومات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی سے ہمارے انفرادی اور اجتماعی کردار کا ہیولا تیار ہوتا ہے۔ الغرض سیاست کی قوتِ قاہرہ سے ہٹ کر ہماری زندگی کی اُس ساری تگ و تاز میں جس کا محرک ہمارا اپنا ذاتی ارادہ اور طبعی میلان یا رجحان ہے اُس میں ہماری معاشرت ہی ہر قدم پر ایک رہنما قوت بن کر ہماری دستگیری کرتی ہے۔

معاشرت اور افکار و احساسات کا یہ تعلق یوں تو دنیا کی ہر قوم کے نزدیک بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور دنیا کی ہر زندہ قوم اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے معاشرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہی مدد لیتی ہے مگر امتِ مسلمہ کے لیے معاشرت کی اہمیت دوسری اقوام کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ہے۔ دوسری اقوام خاکِ وطن سے محبت پیدا کر کے، یا رنگ و نسل کے امتیازات اُبھار کر اپنے اندر کسی حد تک احساسِ قومیت پیدا کر سکتی ہیں۔ ان کے برعکس اسلامی قومیت کی بنیاد چونکہ ایک عقیدہ اور نظریہ پر رکھی گئی ہے جو زمان و مکان کی ساری حد بندیوں سے ماورا ہے اس لیے اس کے افراد کے اندر قومیت کے مشترک احساسات پیدا کرنے کے لیے لازماً اس کے طرزِ معاشرت کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کو جو چیزیں دوسروں سے ممیّز اور ممتاز کرتی ہیں اُن میں ایک تو اُن کے عقائد و نظریات ہیں اور دوسرے اُن کے رہنے سہنے کے ڈھنگ اور اکل و شرب کے طریقے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اسلام جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے ماورا ہے۔ اس کا مقصد با ہمدگر حریف نسلوں کو دولتِ ایمان سے مالا مال کر کے اس متفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی امت کی شکل دینا ہے جس کا اپنا ایک شعورِ ذات ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ بایں ہمہ اسلام نے ان اداروں کے ذریعے جن کی تاسیس میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے اتنی کامیابی تو ضرور حاصل کر لی ہے کہ اس کے مختلف الجنس پیرؤوں میں کچھ نہ کچھ اجتماعی ارادہ اور اجتماعی ضمیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے ارتقا میں بعض ایسے قواعد و ضوابط، مثلاً آدابِ اکل و شرب یا احکامِ طہارت کا غیر متبدل ہونا بھی جو اجتماعی اعتبار سے بے حد اہم ہیں، زندگی کے نقطۂ نظر سے بڑا قابلِ قدر ہے، کیونکہ ان سے معاشرے میں ایک خاص قسم کا خلوص پرورش پاتا ہے اور اس کے ظاہر و باطن میں ایک ایسی یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جو تفرقہ و انتشار اور عدمِ مجانست کی اُن قوتوں کا سدِّ باب کر دیتی ہے جو ایک مرکب اور مخلوط معاشرے میں خوابیدہ رہتی ہیں۔ لہٰذا ان اداروں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے معترضین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے اجتماعِ انسانی کو جو شکل دینے کی کوشش کی ہے اُس کا معنی و منشا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فی الحقیقت کیا ہے۔ وہ اس کی ہیئت اجتماعیہ پر نظر ڈالیں تو اس لحاظ سے نہیں کہ اس سے بحیثیت ایک معاشرہ کس ملک کو فائدہ پہنچتا ہے اور کس کو نہیں بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے پیش نظر جو ساری نوع انسانی کی زندگی میں رفتہ رفتہ اور بتدریج پورا کیا جا رہا ہے "

ان وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر علامہ مرحوم نے کیا ہے، ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ملت اسلامیہ کے معاشرتی ڈھانچوں کی تبدیلی دُور رس نتائج کی حامل ہے۔ ان کے تبدیل ہو جانے کے بعد یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہم ایک ملت کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔ ان ڈھانچوں سے ہمارے جذبات و احساسات وابستہ ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ ایسی متاع گراں مایہ ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ اس ملت کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ہمارا یہ وہ آخری قلعہ ہیں جن میں زندگی کے ہر میدان میں شکست کھا چکنے کے بعد بھی ہم اپنی حفاظت اور پاسبانی کر سکتے ہیں۔

آپ تاریخ پر ایک نگاہ دوڑائیے اور دیکھیے کہ ہمیں کس قسم کے جانکاہ حوادث سے گزرنا پڑا۔ کبھی تو باہمی رقابتوں اور خانہ جنگیوں نے ہماری قوت و طاقت کو منتشر کیا اور کبھی غیر ملکی سامراج نے ہمیں تاخت و تاراج کرنا چاہا۔ ہمارے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار اگیا ہمیں کمزور اور بے بس کرنے کے لیے ہمارے اندر مختلف فتنوں کو ہوا دی گئی، ہماری دولت و ثروت لٹی۔ الغرض وہ کونسی ایسی بربادی ہے جس سے یہ ملت تیرہ سو سال میں دو چار نہ ہوئی ہو۔ لیکن ان ساری فتنہ سامانیوں کے باوجود آخر وہ کونسی طاقت ہے جو اسے ابھی تک زندہ رکھے ہوئے ہے اور اسے برباد ہونے سے مسلسل بچا رہی ہے۔ مجرد نظریات و افکار، خواہ وہ کتنے ہی صحیح اور برحق ہوں کسی قوم کو بہت دیر تک زندہ نہیں رکھ سکتے۔ عام لوگ تصورات کی صحت کے اسی وقت قائل ہوتے ہیں جب وہ پیکر محسوس میں ڈھل کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ان سے احساسات کو غذا مہیا کی جا سکے۔ نظریات جب تک جذبات کا روپ نہیں دھارتے اُس وقت تک کسی قومی یا اجتماعی زندگی کی تشکیل قریب قریب ناممکن ہوتی ہے۔ انسانی فطرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ افکار سے زیادہ احساسات سے سرگرم عمل ہوتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے رہنے سہنے کے ڈھنگ ہمارے کھانے اور پینے کے طور طریقے، ہماری ازدواجی زندگی، مردوں اور عورتوں کا الگ الگ دائروں میں جد و جہد کرنا، ہماری حیاتِ اجتماعی کے یہ مظاہر نہیں بلکہ یہ ہمارے بنیادی تصورات کی عملی تفسیریں ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں اسلام نے جو یہ حکم دیا ہے کہ تم سادہ زندگی بسر کرو۔ جو کچھ تم کماؤ حلال طریقوں سے کماؤ اور اُس میں سے اہلِ حاجت کا حصہ بھی ضرور نکالو، خرچ کرنے کے معاملے میں اسراف سے کام نہ لو۔ مال کو صرف جائز کاموں پر صرف کرو۔ اور مال و اسباب جمع کرنے کی بجائے اپنے خالق و مالک پر بھروسہ کرو، گھروں میں سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال سے باز آؤ۔ تمہاری بود و باش سے کبر و نخوت کی بو نہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اسلام کے ابتدائی دَور کے معاشی حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ دینِ حق نے انسان کو زندگی کا جو تصور دیا ہے یہ سب اُس تصور کے لازمی تقاضے ہیں۔ جب ایک انسان کے ذہن میں یہ خیال اچھی طرح راسخ کر دیا جائے کہ یہ زندگی اور یہ اسبابِ زندگی اللہ کی ایک مقدس امانت ہیں تو اس سے فطری طور پر انسان کے دل میں ایسے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جو اُسے زندگی کی اِسی نہج کو اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ قانونی ضابطوں اور جکڑبندیوں کے بغیر محض اپنے احساسات کے مشوروں سے اپنے لیے اسی سادہ اندازِ زیست کو منتخب کر لیتا ہے۔ دنیا میں رہ کر، بلکہ دنیا کے ہنگاموں میں منہمک ہو کر بھی دنیا سے بے تعلق ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک خاص تصورِ حیات کا مظہر ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کے اندر ماضی و حال میں یہ جذبہ قدرِ مشترک کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے۔ ہماری امت میں جتنے بڑے بڑے صلحاء اور اتقیاء پیدا ہوتے ہیں خواہ اُن کا تعلق حکمرانوں کے گروہ سے تھا یا علماء اور فقہاء کے گروہ سے، سب نے زندگی بسر کرنے کا قریب قریب یہی بے تکلفانہ انداز اختیار کیا۔ ان میں سے کسی نے بھی ذاتی کبریائی کا ٹھاٹھ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ سادہ زندگی جو ہر قسم کے فضول تکلفات سے پاک ہو محض کسی فرد کے ذاتی رجحانات کا عکس نہیں اور نہ ہی یہ ایک مخصوص دَور کے معاشی اور تہذیبی تقاضوں کا ثمرہ ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کا آئینہ ہے۔ وہ معاشرت جس کے رگ و ریشے میں ہمارے بنیادی تصورات سرایت کیے ہوئے ہیں اور جس کی مدد سے ہم ایک خاص طرز کے احساسات پیدا کر کے اپنے ملی وجود کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قریب قریب یہی حال مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کا ہے۔ مرد اور عورت کو جدوجہد کے لیے جو مختلف میدان سپرد کیے گئے ہیں تو یہ بھی عرب کے مخصوص حالات کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اسلام کے بعض بنیادی تصورات کام کرتے ہیں۔ اسلام انسان کے لیے عفت، پاکدامنی، شرم و حیا کو ضروری صفات سمجھتا ہے چونکہ ان صفات کی بنیاد پر ہی ایک مستحکم خاندانی نظام تعمیر کیا جا سکتا ہے اس لیے اسلام نے ہر اُس کام سے انسان کو دُور رہنے کی ہدایت کی ہے جس سے مذکورہ صفات کو نقصان پہنچ سکتا ہو اور ہر اُس فعل کی تائید کی ہے جس سے یہ اوصاف ایک فرد کے اندر پرورش پائیں۔ ظاہر بات ہے کہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول ان صفات کو برقرار نہیں رکھ سکتا بلکہ ان کی ساخت و پرداخت کے لیے ضروری ہے کہ زیب و زینت اور نگاہ کے استعمال پر معقول قسم کی پابندی عائد کی جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے ایک طرف تو جنسی آوارگی کی ساری راہوں پر پہرے بٹھائے ہیں مگر دوسری طرف اس بات کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ جائز طریقوں سے ہر شخص اپنی صنفی خواہش کی تسکین کر سکے۔ پھر اُس نے اس صنفی تعلق کو بعض اخلاقی ضابطوں کا پابند بنا کر اس پر خاندانی نظام کی رفیع الشان عمارت اٹھائی ہے۔ اس وجہ سے ایک مسلمان کا اپنی بیوی کے ساتھ رشتہ مناکحت صرف صنفی جذبہ کے تحت ہی استوار نہیں ہوتا بلکہ اس رشتے میں بہت سے اخلاقی اور روحانی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ رشتہ شرم و حیا کے پاکیزہ احساسات بیدار کرتا ہے اور عائلی زندگی کو اس قدر مامون و محفوظ رکھتا ہے کہ کسی شخص کا طائرِ وسوسہ بھی کسی خاتون کے حریم عصمت کی طرف پرواز نہیں کر سکتا، اس سے خاندانی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں۔ انسان کے دل میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے اور اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو حدود اللہ کا پابند بنائے۔ پھر اسی رشتہ سے ایثار اور مودّت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بڑوں کے لیے عزت و احترام اور چھوٹوں کے لیے شفقت و محبت کے احساسات پرورش پاتے ہیں اور پھر جب یہ احساسات و جذبات

(باقی ص ۶۱ پر)

© rasailojaraid.com